کرشن چندر کے افسانوں میں عوام کی زندگی

شمیمہ نسرین

کرشن چندر اردو ادب کے اہم ترین فنکاروں میں ہیں جن کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جاتا ہے۔ اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کا رتبہ بہت بلند ہے۔ انہوں نے اردو افسانے کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا۔ اپنی زندگی ہی میں انہیں وہ لازوال شہرت حاصل ہوگئی جو کم فنکاروں کو نصیب ہوتی ہے۔ انکے افسانوں کے ترجمے علاقائی زبانوں کے علاوہ متعدد غیر ازملکی زبانوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ کرشن چندر ان ترقی پسند افسانہ نگاروں میں سے ایک تھے جنہوں نے انسانی زندگی کو اپنی تحریروں کا بنیادی حوالہ بنایا۔ انسان دوستی انکے افسانوں میں ہر جگہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ انہوں نے ساری زندگی انسانی سماج اور تہذیب و ثقافت سے اپنا رشتہ قائم رکھا اور اپنے ادب کو سارے جہاں کا دردوغم کے اظہار کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر سنبل نگار لکھتی ہیں:

> "دراصل وہ اشتراکیت کے نہیں بلکہ انسانیت کے پجاری ہیں۔ دنیا میں ظلم، زیادتی، زبردستی، ناانصافی دیکھ کر ان کے دل میں بغاوت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور ان زیادتیوں کو مٹانے کے لئے جو بھی سینہ سپر ہو کرشن چندر اس کے ہم نوا ہو جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ان کا قلم زیادہ بے باک ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ مظلوم انسان ہی ان کے افسانوں کا موضوع ہے۔"[1]

کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا آغاز اس زمانے میں ہوا جب دنیا ایک اقتصادی بحران سے گذر رہی تھی۔ تقسیمِ، فسادات، قحط یہ سب وہ چیزیں تھیں جو انہوں نے بہت قریب سے دیکھیں اور انکا اثر قبول کیا۔

ریسارچ سکالر، شعبہ اردو، راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش

اس زمانے کا سب سے بڑا سماجی مسئلہ جاگیردارانہ نظام تھا۔ جاگیرداروں اور زمینداروں کے ہاتھوں ہر طرف مزدور، کسان، غریب اور نچلے طبقہ کے عوام کا استحصال عام تھا۔ مگر اس زمانے میں کسی بھی ادیب نے اس مسئلہ کو نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن کرشن چندر نے نچلے طبقہ کے عوام کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

> " کرشن چندر کا افسانہ ایک ذاتی اور بلا واسطہ تاثر ہوتا ہے۔ اسے زندگی سے محبت ہے۔ لامحدود اور بے اندازہ محبت۔ اس کے دل میں درد ہے اور آنکھوں میں بصیرت اور زندگی کی وسعتیں اس کے سامنے پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے دل میں سارے جہاں کا درد ہے جو نغمے کی شکل میں پھوٹ پڑنے کے لئے بے قرار ہے۔ اس کا راگ ایک محدود طبقے کا رونا گانا نہیں بلکہ اس کی آواز ایک پوری دنیا کی انسانیت کی ترجمانی ہے۔"[۲]

'بالکونی' کرشن چندر کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ یہ افسانہ انکے مختلف ذہنی سطحوں کی عکاسی ہے۔ 'بالکونی' سے کرشن چندر کے فن میں ایک نیا موڑ شروع ہوتا ہے۔ اس میں ایک طرف تو انہوں نے گلمرگ کی شفق کے منظر کو بیان کیا تو دوسری طرف سرمایہ داری کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس افسانہ کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ حسن کی تصویر کشی کرتے ہوئے بھی زندگی کی بدصورتی کو فراموش نہیں کرتے۔ بلکہ حسن کے پہلو انہیں مظلوموں کی بدنصیبی اور قسمت کے ماروں کی غریبی یاد دلاتے ہیں۔ 'بالکونی' میں سرمایہ داری کے خلاف کرشن چندر اس طرح لکھتے ہیں: " مشینی دور میں ہر انسان روپیہ چاہتا ہے۔ سرمایہ داری نے اس کی زندگی کو تلخ، اس کے دل کو کمینہ، اس کی روح کو غلیظ بنادیا ہے۔[۳]

اس افسانہ میں فردوس ہوٹل کے بڑے بہشتی کا نام عبداللہ تھا۔ جو ایک اجڈ کشمیر کسان تھا۔ جس کی زندگی میں چند خوشیاں تھیں اور ان گنت آنسو۔ بدصورت، بے ڈھنگی چال، آنکھوں کے گرد بڑے بڑے حلقے، سامنے کے دانت غائب، عمر بھی کوئی ساٹھ سال سے اوپر ہی ہوگی۔ عبداللہ کا ایک لڑکا تھا۔ باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم سا معلوم ہوتا تھا۔ عمر گیارہ بارہ سال۔ ہات پاؤں سخت میلے، گھٹنوں تک پانجامہ۔ قمیض کی باہیں

پھٹی ہوئیں۔ بڑی بڑی آنکھیں اور معصوم چہرہ۔ایک معصوم روح جو غریبی کے کیچڑ میں دھنسی ہوئی تھی اور باہر نہ نکل سکتی تھی اور مدد کے لئے چلا رہی تھی۔عبداللہ اپنے بیٹے کو پیار سے غریب کہا کرتا تھا۔لیکن کرشن چندر کو یہ نام سہانہیں جاتا۔غریب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> "عجیب نام ہے غریب۔ یہ نام سن کر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غریبی دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے اور دنیا کے کسی باپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے بیٹے کو غریب کہے لیکن شاید عبداللہ ایک حقیقت بیان کر رہا تھا وہ اپنے بیٹے کو میرا راجہ بیٹا کہہ کر اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکا نہ دینا چاہتا تھا"۔[۴]

عبداللہ کے بیٹے کو لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔عبداللہ کی بھی خواہش تھی کہ غریب ایک بڑا آدمی بنے گا۔ اور زندگی کی ساری راحتوں اور مسرتوں کو واپس لے آئے گا۔اسکی زندگی سنوار جائے گی۔غریب اس کی طرح بہشتی نہیں بنے گا۔لیکن اسکا سپنا سچا نہیں ہوا۔کسی ایسی خوبصورت چاندنی رات میں عبداللہ مر گیا۔دل میں درد اور آنکھوں میں آنسوں لے کر وہ چلے گئے۔عبداللہ کے مرنے کا ذکر کرشن چندر نے ان الفاظ میں کہا ہے:

> "عبداللہ آج ہی کیوں مرا؟ اسی خوبصورت چاندنی رات میں وہ نوجوان لڑکا اور لڑکی ابھی تک گلمرگ کی چاندنی میں نہار رہے تھے۔ ہواؤں میں جنگلی پھولوں کی مہک بسی ہوئی تھی۔کیا عبداللہ آج سے چند سال بعد نہ مر سکتا تھا۔شاید اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر اس کے تخیل کے سپنے سچے کر دیتا۔یعنی یہ کون سا طریقہ ہے مرنے کا کہ صاحب لوگوں کے لئے پانی کی بالٹیاں بھرتے بھرتے مر گیا؟ کیا وہ اپنے کھیتوں میں، اپنے چھوٹے سے باغیچے میں، اپنے مٹی کے گھر میں نہ مر سکتا تھا؟ میں پوچھتا ہوں، یہ کیسا مزاق ہے؟ اس طرح مرنے کا کیا حق تھا؟ وہ اس طرح کیوں فاقے کرتے کرتے، ایڑیاں رگڑتے رگڑتے، جھوٹے سپنے دیکھتے دیکھتے مر گیا؟ دنیا میں یہ لاکھوں کروڑوں عبداللہ شب و روز اس طرح کیوں مرتے ہیں؟ کیوں جیتے ہیں؟ کیوں

رہتے ہیں؟ یہ کیا مزاق ہے؟ کیا تماشہ ہے؟ کیسی خدائی ہے؟'' ۵

کرشن چندر اپنے ادبی رویے اور انداز میں چاہے کتنے ہی رومانی کیوں نہ ہوں مگر ان کی رومانیت ہر جگہ عوامی زندگی، سماجی شعور اور انسان دوستی سے اپنا رشتہ ہر موقع پر برقرار رکھتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں عشق ومحبت کا ذکر کرتے ہیں خالی اور تصوراتی دنیا تک تخلیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اپنے ہر انداز میں وہ انسانی زندگی سے اپنا رشتہ ضرور برقرار رکھتے ہیں۔ عوامی اور سماجی مسائل کا یہی وہ احساس ہے جو کرشن چندر کو غریبوں کی کھولیوں، مفلسوں کی جھونپڑیوں اور پس ماندہ لوگوں کے گندے محلوں میں لے جاتا ہے۔

' کالو بھنگی' کرشن چندر کا ایک بہترین افسانہ ہے۔ یہ ایک گرے پڑے، روکھے پھیکے، بے مزہ اور بے رنگ کردار کی کہانی ہے جس میں کرشن چندر نے مظلوم انسانیت کے حسن کو اجاگر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے کالو بھنگی کی سیدھی سپاٹ زندگی کو بیان کیا ہے۔ آٹھ روپے تنخواہ پانے والا عام آدمی ہے کالو۔ اسکی زندگی میں کوئی دلچسپ پہلو نہیں ہے یا کوئی کونہ بھی ایسا نہیں جو تاریک ہو۔ کالو بھنگی کے ماں باپ بھی بھنگی تھے۔ کالو نے شادی نہیں کی تھی، اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا۔ اسکے ساتھ جو ہونا تھا نہیں ہوا۔ اسکا کوئی بیٹا بھی نہیں تھا جسے گود میں لے کر سب کو دکھائے گا یہ ہے میرا بیٹا۔ اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر روز مریضوں کا بول و براز صاف کرتا تھا۔ ڈسپنسری میں فنائل چھڑکتا تھا، پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا۔ کمپونڈر صاحب کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کی گائے کو چرانے کے لئے جنگل لے جاتا اور دن ڈھلتے ہی انہیں واپس ہسپتال میں لے آتا اور مویشی خانے میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سو جاتا۔ کرشن چندر نے کالو بھنگی کا چہرا اس طرح پیش کیا:

> "اس لئے آج تک کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لئے، اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لئے، اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بدہیئت پاؤں لئے، اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری دردیں لئے، اپنے کولھوں کی ابھری ابھری ہڈیاں لئے، اپنے بھوکے پیٹ اور

اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لئے اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں، پھیلے پھیلے نتھنوں، جھریوں والا گال اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں کے اوپر ننگی چندیا ابھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے اب تک"۔[٦]

کالو بھنگی اچانک ایسا بیمار پڑا کہ اسے ہسپتال میں مریض رکھوا دیا تھا۔ اسکی دیکھ بھال کرنے کے لئے کوئی بھی نہیں تھا۔ کمپونڈر دور سے اس کے حلق میں دوا انڈیل دیتا۔ وہ مرگیا۔ کرشن چندر کے رائے میں:

"جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگا دیا کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا لیکن ہم کوئی اس کے رشتہ دار تھوڑی تھے، اس لئے اس کی آخری تنخواہ بھی بحق سرکار ضبط ہوگئی۔ کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ اور جب وہ مرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال کھلا، ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے دوا تیار کی، مریضوں نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا اور گھر آ کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا، ریڈیو سنا اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے ازراہ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا اور وارڈ کے باہر کھڑے کھڑے باہر چلاتی رہیں۔ جانوروں کی ذات تا آخر۔"[٧]

کرشن چندر کے افسانے بہت سے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے مقابلے میں زیادہ پر تاثیر اور دوررس اثرات کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔ کرشن چندر کے یہاں اردو افسانے کی تکنیک میں غیر معمولی تنوع ہے۔ شاید ہی اردو کے کسی افسانہ نگار نے تکنیکی اعتبار سے اتنے متنوع قسم کے اور کامیاب تجربے کیے ہوں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں سماج کے مختلف طبقات کی زندگی کو موضوع بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس طرح اپنے افسانوں میں انسانی زندگی اور سماجی مسائل کے ان گنت پہلو نمایاں کئے۔ انکے یہاں رومانیت حقیقت نگاری کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ انکے افسانوں میں زندگی کی مشکلات کا شکار ہونے والی پس ماندہ

عورتوں کی بے کسی اور بے بسی کی سچی تصویر کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

'شہزادہ' کرشن چندر کا ایک رومانی افسانہ ہے۔اس رومانی کہانی میں بھی انہوں نیا یک ایسا حیرت انگیز موڑ لیا کہ پڑھنے والا اچھے میں پڑ جاتا ہے۔اس میں کرشن چندر نے سدھا کے مرکزی کردار کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔سدھا کے ماں باپ اور خود سدھا اس کی شادی کے سلسلے میں جس کرب اور عذاب سے گزرتے ہیں وہ ہمارے معاشرے کے نچلے طبقے کا بڑا اجانکد ازلمیہ ہے۔جب تک لڑکی کی شادی نہیں ہو جاتی، اس کے والدین امید وبیم کی سولی پر لٹکے اپنا عزت و ناموس کو داؤ پر لگائے، دم سادھے رہتے ہیں۔ سدھا کالج میں پڑھتی ہے۔وہ ایک سانولے رنگ کی معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔دو سال تک کافی کوشش کے بعد سدھا کے باپ نے ایک لڑکے کو اسکوٹر کا لالچ دے کر معاملہ طے کرلیا۔لڑکا جس کا نام موتی تھا سدھا کو دیکھنے آیا۔موتی واقعی شکل وصورت میں موتی کی طرح اجلا اور خوبصورت تھا۔موتی تو سدھا کے سپنوں کا شہزادہ نکلا۔وہ اسکے تیر نظر کی گھائل ہو چکی تھی۔لیکن سدھا، موتی کو پسند نہ تھی۔موتی سدھا کے رگ وریشے میں، گوشت پوست میں، قلب وذہن میں رچ بس گیا تھا۔سدھا نے موتی کے تصور کو حرز جاں بنا کر، سینے سے لگائے رکھا اور اپنے کنوارپن کے چالیس سال موتی کی ارزو میں بتا دیئے تھے۔چالیس سال بعد جب موتی نے سب کچھ کھو کر سدھا سے شادی کرنا چاہا تو سدھا کے ذہن نے برق رفتار سے سب گئے بیتے واقعات کا احاطہ کرلیا۔اس کے جی میں آئی کہ وہ اس سے چلا چلا کر کہے کہ:

> "اب تم مجھ سے شادی کے لئے کہ رہے ہو؟ مگر میں نے تو اپنی ساری زندگی تمہیں دے دی اور تمہیں معلوم تک نہ ہوا کہ میں نے اپنی ساری جوانی تمہارے تصور میں کھو دی۔اور زندگی کی ہر بہار تمہارے خیال میں کنوادا اور شباب کی ہر مچلتی ہوئی آرزو تمہاری ایک نگاہ کے لئے لٹا دی۔زندگی بھر میں سڑکوں پر اکیلی چلتی رہی تمہارے سائے کے ساتھ۔اندھیرے پارکوں میں بیٹھی رہی تمہارے تصویر کے ساتھ۔میں نے خود اپنے ہاتھ سے خرچ کر کے تم سے ساڑھیوں کے تحفے لئے۔تمہارا زیور پہنا اپنی محنت کا خون کر کے سینیما دیکھا اور اپنے ساتھ کی سیٹ خالی رکھ کر۔میرا باپ مر

گیا۔ میری ماں مرگئی اور میری کوکھ کے بچے مجھے دور ہی دور سے بلاتے رہے۔ اور میں کسی کے پاس نہ گئی۔ تمہارے خیال کو حرز جاں بنائے ہوئے، اپنے کنوار پن کے چالیس سال، آنکھیں، کان اور ہونٹ بند کر کے تمہاری ارزو میں بتا دیئے تھے۔۔۔۔ میں کتنی خوش تھی؟ کتنی مگن تھی میں نے تم سے کبھی کچھ نہ مانگا۔ نہ شادی کا پھیرا، نہ سہاگ کی رات، نہ بچے کا تبسم! صرف ایک تصور، ایک جھلک، ایک عکس رح یار ہی تم سے چاہا تھا اور تم آج پھر جہنم کی چتا میں جلانے کے لئے میرے شہر میں چلے آئے ہو....؟"[۸]

'اجنتا سے آگے' کرشن چندر کی انسانیت کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ اس افسانہ میں غریب کسانوں کے ایک گروہ پر ایک زمیندار کے گولی چلانے اور ایک راجہ کے ہاتھوں مرنے والے کی بہن کو اغوا کئے جانے کا ایسا پر اثر ذکر کیا گیا ہے کہ افسانہ پڑھنے والا افسانہ نگار کے نقطہ نظر کا معترف اور اس سے بہت متاثر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس میں دیہات کے پسماندگی، غربت، جہالت، بھوک اور معاشی بدحالی کی شکار عوام کا ذکر ملتا ہے۔ کرشن چندر کے بیان میں:

"انہوں نے ہمیں گولی ماردی ہے مالک، یہ ماتھے پر گولی کا نشان ہے۔ میں امل بھیرمل کا مجدور ہوں۔ میرے تین بچے ہیں۔ ایک بیوی ہے اور ایک بوڑھی ماں ہے۔ ایک بوڑھا باپ ہے اور سب کا خرچہ مجھ پر ہے۔ اور مجھے مار دیا گیا ہے وہ سب لوگ بھوکے ہیں اور میں نے ہمیشہ کانگریس کو چندہ دیا ہے اور آزادی کے لئے ہڑتال بھی کی ہے مگر آج آجادی آگئی ہے اور اس کی پہلی گولی میرے ماتھے پر ہے مالک۔"[۹]

انسان دوستی کے سلسلے میں کرشن چندر کا اور ایک بے مثال افسانہ 'دانی' ہے۔ اس میں بھوک، افلاس اور ان کے انسانی اور سماجی رشتوں پر اثرات کی کربناکی اور دردناک تصویر کشی کی ہے۔ اس میں بھوک کی ماری دانی

وسیع اور عریض بھوک کی دردناک کہانی ہے۔ دانی کی چچی نے اس کے بار بار کھانا مانگنے پر مجبور ہو کر اسے پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دانی کو نہیں پیٹتی تھی۔ وہ اسکی بھوک کو پیٹتی تھی۔ بھوک اور غربت دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ دنیا کا ظالم سے ظالم نظام بھی اسے مٹا نہیں سکتا۔ جب تک انسان زندہ رہے گا۔ یہ بھوک بھی شاید زندہ رہے گی۔ کرشن چندر کے رائے میں:

> "اور آج بھی کتنی ہی بیویاں اور شوہر مائیں اور بیٹے اور بہوئیں اور نندیں اور بھاوجیں اور چچیرے بھائی اور خلیرے بھائی۔ اور دوست اور یار اور دل کے پیارے اور جگر کے ٹکڑے ہیں جو اس بھوک کی خاطر ایک دوسرے کو پیٹتے ہیں۔ بے وفائی کرتے ہیں۔ جان لیتے ہیں۔ پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں۔ مگر کوئی اس ظالم دیوزاد خوفناک بھوک کو پھانسی نہیں دیتا۔ جس کے منحوس وجود سے اس دنیا میں کوئی انسانی رشتہ اور کوئی تہذیب قائم نہیں ہے۔"[۱۰]

۱۹۴۳-۱۹۴۴ء میں صوبہ بنگال میں ایک بھیانک قحط پڑا جس میں ہزاروں اور لاکھوں لوگوں کی جانیں تلف ہو گئیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایسے خوفناک اور تباہ کن قحط کی مثال نہیں ملتی۔ بہت سارے لوگ بھوک پیاس کی تاب نہ لا کر دم توڑ گئے۔ کرشن چندر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور انہوں نے قحط بنگال کے موضوع پر 'ان داتا' لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ 'ان داتا' تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے وہ آدمی جس کے ضمیر میں کانٹا ہے' دوسرا وہ آدمی جو مر چکا ہے، اور تیسرا یہ آدمی جو ابھی زندہ ہے'۔ کرشن چندر کی انسان دوستی اور دردمندی بھی ان کے اس افسانہ کا بڑا اہم عنصر ہے۔ اس بارے میں اس افسانے میں انہوں نے اپنے نظریات کو جس بیباکانہ اور جرات مندانداز سے پیش کیا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کرشن چندر قحط بنگال کے پس منظر میں اس مغنی کی زبان میں کہتے ہیں:

> "میں سیاستدان نہیں ہوں۔ ستار بجانیوالا ہوں۔ حاکم نہیں ہوں۔ حکم بجالانے والا ہوں۔ لیکن شاید ایک نادار مغنی کو بھی یہ پوچھنے کا حق ہے کہ اس نئی دنیا کی تعمیر میں کیا ان کروڑوں بھوکے ننگے آدمیوں کا بھی ہاتھ ہوگا، جو اس دنیا میں بستے ہیں؟ میں یہ

سوال اس لئے پوچھتا ہوں کہ میں بھی ان بڑے رہنماؤں کی نئی دنیا میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی فسطائیت، جنگ اور ظلم سے نفرت ہے۔ اور گو میں سیاست دان نہیں ہوں۔ لیکن مغنی ہو کر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اداس نغمے سے اداسی ہی پیدا ہوتی ہے۔ جو نغمہ خود اداس ہے، وہ دوسروں کو بھی اداس کر دیتا ہے۔ جو آدمی خود غلام ہے، وہ دوسروں کو بھی غلام بنا دیتا ہے۔"[11]

'ان داتا' کے بارے میں جگدیش چندر ودھاون لکھتے ہیں:

" 'ان داتا' کرشن چندر کے شاہکاروں میں سے ایک ہے۔ اردو افسانہ نگاری میں اسے بقائے دوام کا درجہ حاصل ہے۔ اور کرشن چندر کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے یہ واحد افسانہ ہی کافی ہے۔ اس کی اشاعت کے پچاس سال بعد بھی گردا متدار زمانہ اس کے تاثر اور تب وتاب کو کم نہیں کر سکتی"۔[12]

ابوسعید نورالدین کے رائے میں:

"'ان داتا' میں حقیقت پسندی کا یہ رجحان شراب دوآتشہ بن کر ابھر آتا ہے۔ اس میں رومان پسند کرشن چندر پوری طرح حقیقت پسند اور تلخ نگار بن گئے ہیں۔ ان کے ذہنی، فکری اور جذباتی انقلاب نے ان کے افسانوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔"[13]

کرشن چندر کا افسانہ 'مہالکشمی کا پل' صرف مہالکشمی کے پل کے اوپر بائیں طرف لوہے کے جنگلے پر لہرائی ہوئی چھ ساڑھیوں کی کہانی نہیں ہے۔ بلکہ چھ عام زندگی کی کہانی ہے۔ ہوا میں جھولتی ہوئی پانچ روپے چار آنے کی ساڑھیاں زندگی سے کوئی بڑی قیمتی چیز نہیں مانگتی ہیں۔ نہ کوئی بڑا ملک کوئی بڑی موٹر کار یا کوئی پراپرٹی۔ یہ ایسی کسی چیز کی طالب نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی بہت ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں۔ شانتا بائی کی ساڑھی جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک مانگتی ہے۔ جیونا بائی کی ساڑھی جو اپنی آنکھ کی روشنی اور اپنی بیٹی کی عزت مانگتی ہے۔ ساوتری کی ساڑھی جس کے گیت مر چکے ہیں اور جس کے پاس اپنے بچوں کے اسکول

کے لئے فیس نہیں ہے۔ یہ گڑیا ہے جس کا خاوند بیکار ہے اور جس کے کمرے میں ایک طوطا ہے جو دو دن سے بھوکا ہے۔ یہ نئی دلہن کی ساڑھی ہے جس کے خاوند کی زندگی چمڑے کے پٹے سے بھی کم قیمت ہے۔ یہ بڑی بھنگن کی لال ساڑھی ہے جو بندوق کی گولی کو پل کی پھال میں تبدیل کرنا چاہتی ہے۔ تا کہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر کھل اٹھے۔ اور گندم کے سنہرے خوشے ہنس کر لہرانے لگیں۔ کرشن چندر کی رائے میں:

"یہ چھے ساڑھیاں جو بہت ہی معمولی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں۔ ایسی معمولی معمولی عورتیں جن سے ہمارے دیس کے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے ہیں جہاں ایک کونے میں چولہا سلگتا ہے۔ ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے۔ اور ہر طاقچے میں شیشہ ہے کنگھی ہے اور سیندور کی ڈبیہ ہے۔ کھاٹ پر ننھا بچہ سو رہا ہے۔ الگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں جنہیں ہم ہندوستان کہتے ہیں۔ یہ عورتیں جو ہمارے پیارے پیارے بچوں کی مائیں ہیں۔ ہمارے بھوکے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں۔ ہماری معصوم محبتوں کا گیت ہیں۔ ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اونچا نشان ہیں۔"۱۴

کرشن چندر برصغیر کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے بین الاقوامیت کے احساس کو فزوں سے فزوں تر کیا۔ اس نے اردو افسانے کو ایک نئی ہیت دی اور اپنے ماحول کی عکاسی ایک ایسے نئے انداز سے کی کہ بعد ازاں متعدد افسانہ نگاروں نے کرشن چندر کے چراغ ہی سے اپنے چراغ جلائے اور اسی کی دکھائی ہوئی راہوں پر تا دیر مصروف سفر رہے۔

حوالہ جات

۱۔ڈاکٹر سنبل نگار، اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، علی گڑھ، ۲۰۱۱، ص-۱۶۴

۲۔ڈاکٹراطہر پرویز، کرشن چندراوران کے افسانے، علی گڑھ، ۲۰۱۳، ص–۳۸

۳۔کرشن چندر، بالکونی، کرشن چندراوران کے افسانے، ص–۲۱۷

۴۔ایضا، ص–۲۲۰

۵۔ایضا، ص ۲۳۷

۶۔کرشن چندر، کالو بھنگی، ہمارے پسندیدہ افسانے، علی گڑھ، ۱۹۹۱، ص–۸۸

۷۔ایضا، ص–۹۶–۹۷

۸۔کرشن چندر، شہزادہ، کرشن چندراورانکے افسانے، ص–۲۹۸

۹۔کرشن چندر، اجنتا سے آگے، ممبئی، ۱۹۴۸، ص ۹۳–۹۴

۱۰۔کرشن چندر، دانی، کرشن چندراوران کے افسانے، ص ۳۰۴

۱۱۔کرشن چندر، ان داتا، دہلی، ۱۹۵۹، ص–۶۱

۱۲۔جگدیش چندر ودھاون، کرشن چندر شخصیت اور فن، دہلی، ۱۹۹۳، ص–۴۱۷

۱۳۔ڈاکٹر ابوسعید نورالدین، تاریخ ادبیات اردو، لاہور، ۱۹۹۷، ص–۳۶۷

۱۴۔ڈاکٹراطہر پرویز، اردو کے تیرہ افسانے، علی گڑھ، ۲۰۱۳، ص۔۴۴